© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

قوموں اور ملکوں میں ذہنی اور فکری انقلاب بارش کی طرح خود بخود نہیں آجاتا بلکہ انقلاب کے علمبرداروں کو اس کی کامیابی کے لیے بڑی تگ و دو کرنی پڑتی ہے تب کہیں جا کر عوام کے قلب و دماغ اس انقلاب کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ اس تگ و تاز کے یوں تو متعدد میدان ہیں مگر یہ عام طور پر دو راستے اختیار کرتی ہے ایک یہ کہ جن نظریات کو فروغ دینا مقصود ہو اُن کا پرچار کیا جائے، اُن کی عظمت اور برتری کا نقش بٹھانے کے لیے پُورا زور لگایا جائے۔ اور جو نظریات اس کی ضد ہیں اور جنہیں مٹانا مقصود ہو انہیں غیر عاقلانہ بلکہ احمقانہ ثابت کرنے کے لیے بھرپور کوشش کی جائے یہاں تک کہ لوگوں کے ذہن میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ ان افکار و تصورات سے زیادہ دنیا میں کوئی چیز غلط نہیں۔ اس طریقہ میں پہلے افکار و نظریات کی جنگ لڑی جاتی ہے اور جب اس میدان میں فتح حاصل ہو جائے تو پھر فاتحانہ تصورات کی بنیاد پر اجتماعی زندگی کی تعمیر کی جاتی ہے۔

اس کے مقابلے میں دوسرا طریق یہ ہے کہ آغاز میں نہ تو دلپسند نظریات کا براہِ راست ذکر کیا جائے اور نہ مذموم افکار سے کسی طرح کا تعارض کیا جائے بلکہ اپنے پسندیدہ تصورات کی بنیاد پر جو اجتماعی ڈھانچہ بنانا مقصود ہو اس کی سب سے پہلے بزور بازو تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے۔ عوام جب اس ڈھانچے کو پہلی بار دیکھیں گے تو وہ یقیناً اس سے بُعد و بیگانگی محسوس کریں گے مگر جو لوگ انقلاب کے داعی ہیں، انہیں عوامی احساسات کو خاطر میں لانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اجتماعیت کا دباؤ اُن کے اعمال کو خود بخود نئے سانچوں میں ڈھالتا چلا جائے گا اور اس طرح نئے ماحول سے عوام کی مغائرت اور اجنبیت دُور ہونی شروع ہو جائے گی اور آہستہ آہستہ وہ اس ذہنی کرب اور اضطراب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے بھی نجات حاصل کرلیں گے جو آغاز میں بُعد و بیگانگی کی وجہ سے وہ محسوس کر رہے تھے۔

اس دوسرے طریقِ انقلاب میں سب سے پہلے نئے ماحول سے عوام کی عملی مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ خواہ شروع میں اپنے آپ کو اس مطابقت کے لیے آمادہ نہ پاتے ہوں لیکن جب اُن کے اعمال نئے ماحول سے ہم آہنگ ہونا شروع ہو گئے تو ان کے اندر فطرتاً یہ خواہش پیدا ہوگی کہ وہ زندگی کی جس روش کو اختیار کر رہے ہیں اُس کے لیے فکری اور اخلاقی تائید بھی حاصل کریں۔ کوئی ہوشمند انسان زیادہ دیر تک کسی تضاد میں مبتلا ہونا پسند نہیں کرتا۔ وہ یا تو ماحول کو اپنے افکار کے مطابق دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے۔ یا پھر اگر وہ اپنے آپ کو اس میں بے بس محسوس کرے تو وہ اپنے افکار و تصورات کو ماحول کے مطابق ڈھال لیتا ہے تاکہ اس کی وہ خلش دُور ہو جو فکر و عمل میں تناقض کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور جو اُس کے لیے بعض صورتوں میں بڑی تشویشناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ انسان اپنی زندگی کے مختلف شعبوں اور گوشوں میں مکمل ہم آہنگی چاہتا ہے اور اگر اُن کے درمیان عدم مطابقت ہو تو پھر اُن میں مناسب تغیر و تبدل کر کے انھیں ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح ہم عنان کر دیتا ہے۔ مذہب اور اخلاق کی پوری تاریخ انسان کے اس طرزِ عمل کی شہادت فراہم کرتی ہے۔

دورِ حاضر میں پروٹسٹنٹ مذہب کا وجود اس کلیہ کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ صنعتی دور نے مال و دولت کی جو نہ مٹنے والی ہوس پیدا کی ہے اور اس وجہ سے جو مادہ پرستانہ تصورِ حیات پروان چڑھا ہے اور اس کے نتیجے میں افادیت کو جو اخلاق کا رہنما اصول قرار دیا گیا ہے، پروٹسٹنٹ مذہب نے ان تمام تغیرات کے لیے سندِ جواز فراہم کی ہے۔ اس مذہب کی کوئی ایک قدر اور اس کا کوئی ایک ضابطۂ اخلاق بھی ایسا نہیں جو مستقل اور پائیدار ہونے کی بنا پر اپنے پیرووں سے اس کی غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ کرے۔ اس تحریک کے داعی مارٹن لوتھر نے پورے مذہب کو ایک ایسا سیّال مادہ بنا دیا ہے جو ہر سانچے میں بڑی آسانی کے ساتھ ڈھل جاتا ہے۔ اس لیے اس کے علمبرداروں کو حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ کبھی پہلے کوئی وقت محسوس ہوئی ہے اور نہ آئندہ ہو سکتی ہے۔

انگلستان میں پچھلے دنوں صحبتِ ہم جنس (HOMOSEXUALITY) کو جائز قرار دینے کے لیے مذہبی حلقوں کی طرف سے جو دلائل پیش کیے گئے وہ اس غلط اندازِ فکر کے پوری طرح شاہد ہیں۔

یورپ کی یہ نئی تحریک جسے ہم نشأۃ ثانیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں، احیائے مذہب کی تحریک نہ تھی بلکہ فی الحقیقت یہ مذہب سے مکمل انحراف، اور ماضی سے عملاً بغاوت کی ایک لہر تھی جس نے اہلِ یورپ کو خداوندتعالیٰ کی غلامی سے نکال کر مادہ پرستی کے طلسم میں مبتلا کر دیا۔ اس نئے سامری نے ان کے لیے کئی ایک جھوٹے خدا گھڑ کر اُن سے ان کی پرستش کا مطالبہ کیا۔ ان معبودانِ باطل میں وطن اور قوم کا بُت، رنگ اور نسل کا بُت خاص طور پر مشہور ہیں۔ چونکہ اس تحریک کا خمیر ماضی کی ہر چیز کے خلاف بغاوت اور انحراف سے اٹھایا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ مغرب نے صنعتی دور میں داخل ہونے کے ساتھ ہر اُس قدر کو پامال کرنا ضروری سمجھا جو ماضی سے کچھ تعلق رکھتی تھی اور اس طرح وہ سارے اخلاقی ضابطے بڑی بے رحمی کے ساتھ روند دیئے گئے جو کبھی انسانیت کا سرمایۂ افتخار تھے اور جن کی وجہ سے آدمیت کا بھرم قائم تھا۔

اخلاقی اقدار کی پامالی اور مذہبی روایات کے خلاف بغاوت کی وجہ سے سماجی زندگی میں بڑے تباہ کن اثرات رونما ہوئے۔ شرم و حیا، عصمت و عفت، نیکی اور پاکبازی، غرض انسانی عز و شرف کی وہ ساری قدریں جن کی اساس مادی سود و زیاں کے بدلتے ہوئے پیمانوں کے بجائے اخلاق و روحانیت کی مستقل بنیادیں تھیں، بڑی سرعت کے ساتھ مٹنے لگیں اور انسان نے حسی خواہشات کی اس حد تک غلامی اختیار کی کہ اس کی حیثیت ایک آزاد جانور کی سی بن کر رہ گئی۔ مغرب کی بعض جدید تحریکات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انسان بڑی سرعت کے ساتھ انسانیت کی بلند سطح سے گر کر حیوانیت کی پست سطح پر اتر رہا ہے۔ برہنگی کا جو جنون آج مغرب میں پایا جاتا ہے وہ نفسیاتی اعتبار سے اس رجعت قہقری کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مظہر ہے۔

انسان کے سفلی جذبات پر جب اخلاقی ضوابط کا تسلط ختم ہؤا تو انسان بالکل ایک بے لگام بپھرے ہوئے جانور کی سی حرکتیں کرنے لگا ظاہر بات ہے کہ افکار و نظریات کی اس بے راہ روی اور جذبات کی اس مطلق العنانی کے ساتھ کسی اجتماعی زندگی کا وجود ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اب نئے آزاد منش انسانوں کو ایک اجتماعی ہیئت میں منظم رکھنے کے لیے معاشرے کو اپنی گرفت زیادہ مضبوط کرنی پڑی۔ اس سے ریاست کا دائرۂ کار غیر معمولی حد تک بڑھا معیشت کا حلقہ بے حد وسیع ہوا اور معاشرتی دباؤ میں شدید اضافہ ہؤا اور اس طرح انسان اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو کر معاشرتی، معاشی اور سیاسی جکڑ بندیوں کا غلام بن کر رہ گیا۔ یہ نئی غلامی بالکل فطری نتیجہ ہے مذہب سے آزادی کا۔ اگر ایک انسان زندگی کے اعلیٰ و ارفع اصولوں کو اپنا کر خود اپنے آپ کو کسی ضابطے کا پابند نہیں بناتا تو پھر اسے خارجی دباؤ سے ایک مخصوص روش اور ایک معین اسلوبِ حیات اپنانے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ جتنی کوئی قوم اخلاقی اصولوں سے منحرف اور روایات کی باغی ہو گی اسی نسبت سے اُس کا اجتماعی ڈھانچہ سخت اور بے حس ہو گا۔ جرمنی میں مارٹن لوتھر نے لوگوں کو مذہب سے بغاوت اور ماضی کی روایات سے انحراف کا جو سبق دیا اس سے وہاں آمریت کو فروغ ہوا۔ چنانچہ یہ بات جرمن قوم کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے کہ وہ مضبوط قسم کی اجتماعی جکڑ بندیوں کے بغیر اپنی صلاحیتوں کو تعمیر و ترقی کی راہ پر نہیں لگا سکتی۔ اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے فکر و عمل کی بے پناہ قوت عطا کی ہے لیکن ماضی سے انحراف اور مذہبی ضابطۂ اخلاق سے بے نیازی نے اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ اور اعتدال کو ختم کر دیا ہے اور اس کا جذباتی پن مختلف اوقات میں نہایت تند و تیز تحریکات کی صورت میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

جرمن قوم کا تو مذہب سے تھوڑا سا رشتہ بہر حال قائم ہے اس لیے اس کی اجتماعی جکڑ بندیوں میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کبھی کبھی ڈھیلا پن پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے، مگر اس کے مقابلے میں روس کے اندر جو سرخ انقلاب رونما ہوا چونکہ اُسے مذہب اور اس کی روایات کو یکسر مٹانا مقصود تھا اس لیے وہاں زیادہ شدید اور سخت جکڑ بندیوں سے کام لینا پڑا تاکہ "روح کے باغی" انسان کو ایک نظم وضبط کا پابند رکھا جائے۔

جس طرح ہوا پانی اور خوراک انسانی جسم کی بنیادی ضرورت ہے بالکل اسی طرح مذہب انسانی روح کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ بھوک اور پیاس کا ستایا ہوا انسان بسا اوقات بیچارگی کے عالم میں اپنا جذباتی اور دماغی توازن کھو کر غیر آئینی اور ناپسندیدہ حرکات پر اُتر آتا ہے بالکل اسی طرح مذہب سے بیگانہ اور اس کی روایات سے ناآشنا آدمی دیوانوں کا سا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے۔

انسان کو اندر سے کسی نظم کا پابند بنانے کیلیے مذہب انتہائی ضروری ہے تاکہ اس کے فکر و احساس میں انتشار نہ پیدا ہونے پائے۔ روس نے جب مذہب سے مکمل بغاوت کی راہ اختیار کی تو اس کے لیے یہ بات ناگزیر تھی کہ وہ اجتماعی زندگی کے لیے ایک ایسا بے رحم ڈھانچہ تیار کرے جس میں روحانیت و اخلاق سے محروم لوگوں کو نہ صرف اجتماعی زندگی کا پابند بنایا جائے بلکہ اُن کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھایا جائے۔

اس بے رحم ڈھانچے سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے پہلے اہلِ روس کو ذہنی طور پر تیار نہ کیا گیا بلکہ مختلف قسم کی سازشوں کے ذریعہ سے اشتراکیت کے علمبرداروں نے پہلے حکومت پر قبضہ کیا اور پھر اپنے نظریات کی بنیاد پر زبردستی اجتماعی نظام کی تشکیل کر دی۔ عوام جب اس کے شکنجوں میں پوری طرح کسے جانے کی وجہ سے بالکل بے بس ہو گئے اور انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اسے پسند کریں نہ کریں مگر اُن کے اعمال کو بہرحال وہی نہج اختیار کرنی ہے جو اشتراکیت نے اُن کے لیے متعیّن کی ہے تو انہوں نے اپنی ذہنی آویزش کو دُور کر کے اطمینان حاصل کرنے کے لیے اپنے افکار میں تبدیلی پیدا کرنی شروع کی۔ انسان جب بھی کسی غلط راہ پر پڑتا ہے تو پہلے چند قدم بُرائی سمجھ کر ہی اٹھاتا ہے۔ پھر اُسے ناگزیر بُرائی سمجھ کر اس کے خلاف جذبۂ نفرت و حقارت کو رفتہ رفتہ کم کرتا ہے۔ ایک لمبی مدت کے بعد یہ ناگزیر برائی فطری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضرورت بن جاتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ ایک مستحسن فعل کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس کے اندر وہ مجبوری کا احساس ختم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ ابتداءً اسے اختیار کرنے پر مجبور ہوا تھا۔

گزشتہ صفحات میں اس بات کا تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ یورپ میں سب سے پہلے صنعتی حالات میں اچانک تبدیلی کی وجہ سے وہاں کے اجتماعی ڈھانچے بدلنے شروع ہوئے تھے۔ یہ ڈھانچے بڑے مضبوط تھے۔ ان کے مقابلے میں مذہب کے علمبرداروں نے بڑی بزدلی اور پست ہمتی کا ثبوت دیا اور اس کے اصولوں کو اجتماعی ڈھانچوں کے مطابق خود بدلتے رہے۔ تبدیلی کا یہ عمل اس حد تک جاری رہا کہ مذہبی اقدار کی امتیازی حیثیت ہی ختم ہو گئی۔ آج عیسائیت کا جو پروٹسٹنٹ ایڈیشن پایا جاتا ہے اُسے دیکھنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ محض اضافی عمل کی حیثیت سے اہلِ مغرب کے ساتھ چپکا ہوا ہے۔ وہ کسی گام بھی اپنے آپ کو اس کی رہنمائی کا محتاج نہیں پاتے۔ اگر اہل یورپ کو سرمایہ داری کے فروغ کے لیے سود کو جائز کر دینے کی ضرورت پیش آئی تو اُسے مذہب کی بارگاہ سے سند جواز مل گئی۔ اگر جارحانہ قوم پرستی کے جنون کے لیے غلط طرزِ فکر کی ضرورت محسوس ہوئی تو مذہب نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ اپنی عالمگیر حیثیت کو ختم کر کے انسانوں کے سامنے قومیت کا بُت تراش کر رکھ دیا۔ کوئی ایک مقام بھی ایسا نہ تھا جس پر مذہب نے انسانیت کے قافلوں کو غلط راہوں پر جانے سے روکنے کی کوشش کی ہو۔ مذہب کے علمبرداروں کی حیثیت خیمہ برداروں کی سی بن گئی تھی، جو مذہب کے خیمے اٹھائے ہوئے بڑی خاموشی کے ساتھ قافلوں کے پیچھے چل رہے تھے، اور انہیں جس جگہ بھی مذہب کے سائے میں سستانے کی ضرورت پیش آئی وہ انہیں حکم دیتے اور یہ بیچارے ان کے لیے مذہب کا سایہ مہیا کر دیتے۔ انسان سفر میں دقّت اور دشواری اُس وقت محسوس کرتا ہے جب خیمے اس سے دُور ہوں۔ مگر جب اجتماعی زندگی کی تگ و دو میں مذہب کے علمبردار خیمہ برداروں کی طرح انسانوں کے پیچھے گامزن رہیں تو اُن کے اندر وہ احساسِ زیاں کبھی پیدا نہیں ہونے پاتا جو ایک نہایت آرام دہ ماحول کو چھوڑنے کی وجہ سے انسان کے اندر اُبھرتا ہے۔ انسان کے دل میں خدائے واحد کی بندگی ترک کرنے اور اہرمن کی غلامی اختیار کرنے پر اضطراب اُسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب وہ یہ محسوس کرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ اُس نے بُرا غلط انتخاب کیا ہے۔ لیکن جب کوئی مذہب ان دونوں کی بندگی کو ایک ساتھ جائز قرار دے دے تو پھر اُس کے اپنانے والوں میں وہ ذہنی خلش باقی نہیں رہتی جو ایسے حالات میں انسان کو بالعموم پریشان کرتی ہے۔

مارکس نے تاریخی تغیرات کا جو تجزیہ کیا ہے اور اس میں خصوصاً مذہب کے موقف اور مرتبہ کے بارے میں جو رائے دی ہے وہ مذہب کی پوری تاریخ کے غیر جانبدارانہ مطالعہ پر مبنی نہیں ہے۔ اُس نے مسیحی پادریوں کے طرزِ عمل کو دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مذہب بھی معاشرتی، معاشی اور سیاسی اصولوں کی طرح ذرائع پیداوار کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ بلکہ یہ ذرائع پیداوار جس قسم کے طبقاتی تعلقات کو جنم دیتے ہیں مذہب ان کی عکاسی کرتا ہے، لہٰذا مذہب کوئی مستقل اور پائیدار لائحہ عمل نہیں بلکہ ان ذرائع کا تابع ہے اور ان کے ساتھ ہی بدلتا رہتا ہے۔

مارکس کا یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ وہ اپنے نظریات کو صحیح اور برحق سمجھنے کے لیے اپنے مطالعہ اور مشاہدے میں بڑی جانبداری سے کام لیتا ہے اور ڈاروِن کی طرح سلسلۂ واقعات کی جو کڑی اس کے اصولوں کی مؤید نہ ہو اُسے نظر انداز کر دیتا ہے، یا اگر بعض کڑیاں غائب ہونے کی وجہ سے اُس کے موقف کی پوری طرح تائید نہ ہوتی ہو تو انہیں خود اپنے ذہن سے گھڑ لیتا ہے۔ یہ غالباً اُس کی فنی چابکدستی ہے کہ اس نے مذہب کے معاملے میں اسلام کے تاریخی کردار کو محض اس وجہ سے نظر انداز کیا کہ اس سے تاریخ کی مادی تعبیر ممکن نہ تھی۔ اسلام کا تو خیر ذکر ہی کیا ہے، مارکس نے تو خود مسیحیت کے بارے میں بھی کسی گہری سوچ بچار کا ثبوت نہیں دیا۔ اس نے غلطی سے یہ اندازہ لگایا کہ پروٹسٹنٹ چرچ نے مذہب کے اندر جو تغیرات کیے ہیں وہ معاشی تقاضوں کے رہینِ منت ہیں، درآنحالیکہ یہ تغیرات نفس پرستی کے مطالبہ کی وجہ سے تھے۔ ان تغیرات کا سب سے اہم سبب دینِ مسیحی کے علمبرداروں کی پست ہمتی اور ناعاقبت اندیشی ہے۔ ان لوگوں نے چند دنیوی فوائد کی خاطر مذہب کے معاملے میں جس بزدلی کا مظاہرہ کیا ہے وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاریخ کی ایک المناک داستان ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ میں صرف چند مثالیں دے کر حقیقت کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

گزشتہ چند سالوں سے مغربی ممالک میں "صحبتِ ہم جنس" کا مرض بڑی شدت کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان ملکوں کے معاشی ماحول نے بعض ایسے معاشرتی تقاضے پیدا کیے ہیں جن کے تحت یہ عارضہ ناگزیر ضرورت بن گیا ہے۔ ماہرینِ نفسیات نے اس کے جو متعدد وجوہ بتائے ہیں ان میں سب سے بڑا سبب آزاد شہوت رانی کا وہ بڑھتا ہوا جنون ہے جو لذتیت کی نئی نئی صورتیں پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس بنا پر یہ مرض کوئی معاشی تقاضا نہیں بلکہ طبیعت کا ایک فساد ہے۔ اگر مسیحیت کے مبلغین بزدل نہ ہوتے تو وہ جسمانی عوارض کے معالجین کی طرح اس روحانی مرض کا بڑی ہمت اور پامردی سے علاج کرتے۔ مگر افسوس کہ ہر روحانی بیماری کے لیے انہوں نے ہر مرحلہ پر بڑی کمزوری اور بزدلی کا ثبوت دیا اور بڑی پست ہمتی کے ساتھ ہر میدان میں ہتھیار ڈالتے چلے گئے۔ "صحبتِ ہم جنس" کے سلسلے میں انگلستان کے لارڈ پادری نے جو تقریر کی وہ اس بزدلی کی واضح دلیل ہے۔ انہوں نے اس شرمناک برائی کو قانونی حیثیت دینے کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ دی کہ چونکہ یہ مذموم فعل اب عام لوگوں کا دل پسند مشغلہ بن چکا ہے اس لیے اس راہ میں جو قانونی رکاوٹ انہیں درپیش ہے اسے بھی دور کر دیا جائے تاکہ لوگ کھلے بندوں ہر قسم کے خوف سے بے نیاز ہو کر اس فعل کا ارتکاب کرتے رہیں اور ان کے ذہن میں نہ تو ضمیر کی خلش رہے اور نہ قانونی احتساب کا ڈر باقی رہے۔

امریکہ کے پروٹسٹنٹ پادریوں کا ایک گروہ اس سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ پچھلے دو سال سے وہاں ۵۰ پادریوں نے ایک (COUNCIL ON RELIGION AND THE HOMOSEXUAL) قائم کر رکھی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ "ہم جنسی" کے خلاف کلیسا کی نفرت کو ختم کیا جائے، اس گناہ کے مرتکبین کو چرچ میں یکساں عزت کے ساتھ قبول کیا جائے، ان قوانین کو ختم کرایا جائے جو اس فعل کو جرم قرار دیتے ہیں اور "ہم جنسوں" کو پورے "شہری حقوق" دلوائے جائیں، یعنی باہمی رضامندی سے ہم جنسی کے تعلقات قائم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے کے معاملہ میں وہ اسی طرح آزاد ہوں جس طرح مغربی معاشرے کے مرد و زن زنا بالرضا کے معاملہ میں آزاد ہیں۔ اس وقت تک امریکہ کی ریاست الینوئس کے قانون میں تو یہ آزادی تسلیم کی جا چکی ہے۔ اب پورے امریکہ میں اسے تسلیم کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس گروہ میں لوتھران، بیپٹسٹ، ایپسکوپل اور یونائٹڈ چرچ آف کرائسٹ وغیرہ متعدد مذہبی فرقوں کے پیشوا شامل ہیں۔ ان میں سے ایک پادری صاحب رابرٹ کرومی (CROMEY) فرماتے ہیں کہ "میرا یہ عقیدہ ہے کہ ایک ہی جنس کے دو شخص (خواہ وہ دو مرد ہوں یا دو عورتیں) باہم محبت کر سکتے ہیں اور اس محبت کو جنسی تعلق کے ذریعہ سے زیادہ گہرا کر سکتے ہیں"۔ نیز ان کا ارشاد ہے کہ "میں کہتا ہوں اگر ایک ہی جنس کے دو شخص ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور ذمہ دارانہ تعلقات رکھتے ہوں تو ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس طرح بھی وہ مناسب سمجھیں اس محبت کا عملاً اظہار کریں"۔ (ٹائم۔ فروری ۱۹۶۷ء)

مارکسٹوں کا دعویٰ ہے کہ کسی فعل کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں فیصلہ کن چیز معاشی تقاضے ہیں۔ لیکن یہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ طبیعتوں کی آوارگی اور مزاجوں کا لا ابالی پن برائیوں کے لیے نت نئے راستے کھولتا رہتا ہے۔ انگلستان اور امریکہ کے پروٹسٹنٹ پادریوں کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر انہوں نے مذہبی اصولوں کے تحت اس جرم کی راہ روکنے کی کوشش کی اور عوام کو اس کی اجازت نہ دی تو ان کا مسیحیت سے جو برائے نام رشتہ بھی قائم ہے وہ بھی ٹوٹ جائے گا اور لوگ پھر علانیہ اس کے خلاف بغاوت پر اتر آئیں گے۔ لہٰذا جو کچھ لوگ حلال کرنا چاہتے ہیں یا حلال کر چکے ہیں، کلیسا کو بھی اسے حلال کر دینا چاہیے تاکہ لوگ کلیسا سے وابستہ رہ سکیں۔ آپ اس طرزِ استدلال کا بغور مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ یہ استدلال کتنا غلط اور دینی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے کس قدر تباہ کن ہے اور اسے اختیار کرنے کے بعد کسی مذہب کے اصولوں کی کہاں تک محافظت اور پاسبانی کی جا سکتی ہے۔ جس معاشرے میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ ہے، جہاں عورتیں عمر بھر شادی کے لیے ترستی رہتی ہیں، اور جو بیچاری اپنی کفالت کی خود ذمہ دار ہوتی ہیں، جہاں بچوں کی پرورش کا بہت سا بوجھ خود حکومت برداشت کرتی ہے وہاں اگر مجرد اخلاقی فساد کے تحت لوگ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غیر فطری افعال کے ارتکاب پر مُصر ہوں تو اسے معاشی تقاضا قرار دینا اگر سراسر جہالت نہیں تو اور کیا ہے اور اس سے زیادہ ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایسے ظالموں اور فاسقوں کے لیے مذہبی اور قانونی پابندیاں ختم کرنے کی وہ حضرات سفارش کریں جو روحانیت اور اخلاق کے علمبردار ہونے کی وجہ سے معاشرے کی اخلاقی حالت سدھارنے کے براہِ راست ذمہ دار ہیں۔

پروٹسٹنٹوں کی اس بے راہ روی نے رومن کیتھولک محاذ کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اب انہوں نے بھی شکست خوردہ ذہنیت سے کام لیتے ہوئے مغربی معاشرے کی ہر برائی کے ساتھ مفاہمت کرنی شروع کر دی ہے۔ چنانچہ ضبط ولادت کے معاملہ میں ان کی تازہ ترین شکست ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔ یہ تاریخ کا ایک بڑا المیہ ہے کہ رومن کیتھولک کلیسا نے یہ مفاہمت کی روش ایسے مرحلے پر اختیار کی ہے جب "وقتی تقاضوں" کا طلسم کافی حد تک ٹوٹ چکا ہے اور انسانیت پر یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ جن رجحانات کو آج وقت کے ناگزیر تقاضے کہہ کر اخلاقی اقدار میں تغیر و تبدل کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ جدید تہذیب کی محض فریب کاریاں ہیں۔ امریکہ میں کیتھولک مذہب کے ماننے والوں کے ان تازہ رجحانات کا ابھی حال ہی میں وہاں کے ایک معروف ہفتہ وار رسالہ میں جائزہ شائع ہوا ہے جو اس کی شہادت فراہم کرتا ہے۔

جو حضرات رومن کیتھولک عقائد سے واقفیت رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو پوری طرح جانتے ہیں کہ ان کی رُو سے ضبطِ تولید اور اسقاطِ حمل دونوں افعال یکسر حرام ہیں۔ ایک مدت تک رومن کیتھولک لوگ یورپ اور امریکہ میں رہتے ہوئے اور پروٹسٹنٹوں کے استدلال کو جانتے ہوئے اور مغربی ماحول کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے بھی ان دونوں برائیوں سے مجتنب رہے لیکن جوں جوں ان کے اندر اخلاقی بے راہ روی پیدا ہوتی گئی انہوں نے ان دونوں برائیوں کا ارتکاب شروع کر دیا۔ اس جائزے کے مطابق اب ۳۰ فیصد رومن کیتھولک ضبطِ ولادت کے عملاً قائل ہیں۔ جو لوگ مانع حمل گولیوں یا دوسرے مصنوعی طریقوں سے اولاد کی پیدائش کو روکتے ہیں ان میں ۶۰ فیصد تعداد ان نوجوانوں کی ہے جن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی عمر ۲۵ سال سے کم ہے۔ اس تعداد کا ۵۴ فیصد کالج کے طالبعلموں اور ۴۲ فیصد ہائی سکول کے طلباء پر مشتمل تھے۔ قریب قریب یہی حال اسقاطِ حمل کا ہے۔

خواب و خیال میں رہنے والے لوگ رومن کیتھولک مذہب کے ماننے والوں میں فکر و عمل کی اس تبدیلی کو بے شک معاشی تقاضوں کا دباؤ قرار دیتے رہیں۔ لیکن جب ہم ان اعداد و شمار پر ذرا گہری نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس تبدیلی کے پیچھے سوائے ذہنی اور اخلاقی آوارگی کے اور کوئی جذبہ کارفرما نہیں۔ ضبط ولادت کا اہتمام کرنے والوں کی زیادہ تعداد ہائی سکول اور کالج کے طلباء کی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ طلبہ زیادہ سے زیادہ ۱۵ سے لیکر ۲۵ سال کی عمروں کے ہوں گے اور وہ ابھی ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہوں گے۔ ان کے ہاں ضبطِ ولادت کا رجحان اور مانع حمل گولیوں کا استعمال اگر اخلاقی بے راہ روی کی وجہ سے نہیں تو آخر کس وجہ سے ہے؟

اور پھر یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ یورپ میں صنعتی انقلاب کے آغاز میں جب مزدوروں پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا تھا اور سرمایہ دار انہیں قوت لایموت تک فراہم کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے اس وقت تو رومن کیتھولک لوگوں نے ان سب دشواریوں اور مشکلات کو بڑی جرأت کے ساتھ برداشت کیا اور ضبطِ ولادت کو حرام سمجھ کر اس سے مکمل اجتناب کرتے رہے مگر اب جبکہ ان مغربی ملکوں میں زندگی کے اوقات کم از کم اتنے تلخ نہیں رہے جتنے صنعتی انقلاب کے ابتدائی دور میں تھے، بلکہ اب اُسے ہر قسم کی سہولتیں میسر ہیں تو وہ اپنے نزدیک ایک ناجائز بلکہ بالکل حرام فعل کو جائز اور حلال منوانے پر تلا ہوا ہے۔

یہ سب شواہد اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ مغرب میں جن تقاضوں کا ہوا کھڑا کر کے مذہب کے اندر تغیرات لانے کی کوشش کی گئی اُن میں سے کوئی ایک تقاضا بھی ایسا نہ تھا جو فی الحقیقت ان تغیرات کا متقاضی تھا۔ اصل میں اہلِ مغرب کی عیش پسندی اور لذت پرستی نے اُن کے مزاج کو بگاڑ دیا اور اس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خاطر انہوں نے مذہبی بندھنوں کو توڑ کر ہر قسم کی اخلاقی ذمہ داریوں سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ مگر اُن میں چونکہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی اخلاقی جرأت نہ تھی کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں محض لذتِ نفس کی وجہ سے کر رہے ہیں۔ اس بنا پر انہوں نے وقتی تقاضوں کی آڑ لے کر مذہب کو برباد کیا۔

انسان کی خارجی زندگی ہمیشہ داخلی زندگی کی تابع ہوتی ہے۔ جب انسان اندر سے بدل جائے تو پھر وہ اپنے طرزِ عمل کے لیے وجہِ جواز ڈھونڈتا پھرتا ہے اور اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے انہیں عصری تقاضوں کا نام دے کر من مانی کارروائیوں کے لیے زمین تیار کرتا ہے۔ اجتماعی ڈھانچے بلاشبہ بڑے طاقتور اور مضبوط ہوتے ہیں اور یہ کسی قوم کی سیرت و کردار کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کے لیے بڑے مؤثر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ناقابلِ تغیر نہیں ہوتے۔ جب اندر کا انسان انہیں تبدیل کرنے کا عزم کر لیتا ہے تو پھر یہ بہت جلد ٹوٹ جاتے ہیں اور انسان کی قوتِ فکر و عمل انہیں جس طرح چاہتی ہے موڑ کر رکھ دیتی ہے۔ عزم و ہمت رکھنے والے انسان کبھی اُن کے ہاتھ میں بے بس کھلونا بن کر نہیں رہے۔ اُنہوں نے ہمیشہ انہیں اپنے افکار و نظریات کے مطابق ڈھالا ہے۔ ان تقاضوں کی ہیبت و جبروت اور ان کے مقابلے میں انسانوں کی بے بسی اور ان کے سانچوں میں ڈھل جانے کے لیے ان کی مجبوری کے وہی لوگ قائل ہوتے ہیں جن کی روح بیمار ہو اور جن کی نفسانی خواہشات ان سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے خود بے تاب ہوں۔ اجتماعی زندگی کا دھارا بے شک بہت بڑی قوت ہے اور یہ انسان کو جس طرف چاہتا ہے فکری و عملی اعتبار سے بہا کر لے جاتا ہے۔ لیکن یہ دھارا کوئی تقدیرِ الٰہی نہیں ہے جس کے رخ کو بدلا نہ جا سکے۔ انسان نے اپنی ہمت سے ان دھاروں کو پہلے بھی اپنے منشا اور مرضی کے مطابق موڑا ہے اور آج بھی وہ انہیں موڑ سکتا ہے۔ باقی رہے وہ لوگ جو ان دھاروں کے رُخ پر بہنے کے دل و جان سے خود آرزو مند ہوں، ان کے لیے اس چیز کی بے پناہ قوت کے تذکرے واقعی بڑے مفید اور خوش کن ہیں کیونکہ ان کے ساتھ ہم آہنگ ہونے سے اُن کی دلی آرزوؤں اور تمناؤں کو تکمیل کا راستہ ملتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پچھلے دنوں عیسائیوں کے ایک مشہور مجلّہ "بیداری" (AWAKE) میں گھانا کے سپریم کورٹ کا ایک بڑا اہم فیصلہ شائع ہوا ہے۔ اس فیصلے کا پس منظر بڑا دلچسپ ہے۔ ایک ہائی سکول کے دو لڑکوں نے اپنے ہیڈ ماسٹر کی حکم عدولی کرتے ہوئے قومی جھنڈے کو سلامی دینے سے صاف انکار کر دیا۔ جب اُن سے اس باغیانہ طرزِ عمل کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے صاف کہا:

"ہمارے نزدیک بندگی کا سب سے زیادہ مستحق ہمارا آسمانی خدا ہے اور ہم اُسی کے سامنے سرِ نیاز خم کریں گے خواہ اس راہ میں انسان کے خود ساختہ قوانین ہمارے لیے کتنی ہی مشکلات پیدا کریں۔"

ان کے اس جواب کو سُن کر ہیڈ ماسٹر سخت مشتعل ہُوا اور انہیں دفتر میں بلا کر اس طرزِ عمل کے بارے میں سختی سے باز پرس کی۔ مگر یہ دونوں طلبا اپنے موقف پر قائم رہے۔ ان میں سے ایک نے جس کا نام پال تھا، کہا:

"ہم جھنڈے کو سلامی دینے سے معذور ہیں کیونکہ یہ فعل ہمارے دین کے بنیادی عقیدے سے متصادم ہے اور ہم دیانتداری سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح کی سلامیاں درحقیقت خدائے واحد کی پرستش کے علاوہ کچھ دوسرے خداؤں کی پرستش کے مترادف ہیں۔"

پال کے دوسرے ساتھی اڈمنڈ نے کتاب دانیال کے باب تین میں سے چند آیات اپنے اس موقف کی تائید میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے کوئی انوکھی اور غیر اخلاقی بات نہیں کی۔ ہم نے جو کچھ کیا ہے وہ دانیال کے تین مقدس رفقاء کار، سدرک، میک اور عبدنجو کی پیروی میں کیا ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب، کیا آپ کو ان تین حضرات کا قصہ یاد نہیں۔ اس کے بعد انہوں نے بائبل سے یہ قصہ خود پڑھ کر سنایا:

"نبوکدنضر بادشاہ نے ایک سونے کی مورت بنوائی جس کی لمبائی ساٹھ ہاتھ اور چوڑائی چھ ہاتھ تھی اور اُسے دورا ہے کے میدان صوبۂ بابل میں نصب کیا۔ تب نبوکدنضر بادشاہ نے لوگوں کو بھیجا کہ ناظموں اور حاکموں اور سرداروں اور قاضیوں اور خزانچیوں اور مشیروں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مفتیوں اور تمام صوبوں کے منصبداروں کو جمع کریں تاکہ وہ اس مورت کی تقدیس پر حاضر ہوں جس کو نبوکدنضر بادشاہ نے نصب کیا تھا۔ تب ناظم اور حاکم اور سردار اور قاضی اور خزانچی اور مشیر اور مفتی اور صوبوں کے تمام منصبدار اُس مورت کی تقدیس کے لیے جسے نبوکدنضر بادشاہ نے نصب کیا تھا جمع ہوئے اور وہ اُس مورت کے سامنے جس کو نبوکدنضر نے نصب کیا تھا، کھڑے ہوئے۔ تب ایک منادی نے بلند آواز سے پکار کر کہا، اے لوگو، اے اُمتو اور اے مختلف زبانیں بولنے والو! تمہارے لیے یہ حکم ہے کہ جس وقت قرنا اور نے اور ستار اور رباب اور بربط اور چغانہ اور ہر طرح کے ساز کی آواز سنو تو اُس سونے کی مورت کے سامنے جس کو نبوکدنضر بادشاہ نے نصب کیا ہے گر کر سجدہ کرو اور جو کوئی گر کر سجدہ نہ کرے اُسی وقت آگ کی جلتی بھٹی میں ڈالا جائے گا۔ اس لیے جس وقت سب لوگوں نے قرنا اور نے اور ستار اور رباب اور بربط اور ہر طرح کے ساز کی آواز سنی تو سب لوگوں نے امتوں اور مختلف زبانیں بولنے والوں نے اُس مورت کے سامنے جس کو نبوکدنضر بادشاہ نے نصب کیا تھا گر کر سجدہ کیا۔ پس اُس وقت چند کسدیوں نے آکر یہودیوں پر الزام لگایا۔ انہوں نے نبوکدنضر بادشاہ سے کہا اے بادشاہ ابد تک جیتا رہ۔ اے بادشاہ تو نے یہ فرمان جاری کیا ہے کہ جو کوئی قرنا اور نے اور ستار اور رباب اور بربط اور چغانہ اور ہر طرح کے ساز کی آواز سے گر کر سونے کی مورت کو سجدہ نہ کرے آگ کی جلتی بھٹی میں ڈال دیا جائیگا۔ اب یہ چند یہودی ہیں جن کو تو نے بابل کے صوبہ کی کارپردازی پر متعین کیا ہے یعنی سدرک اور میسک اور عبدنجو۔ ان آدمیوں نے اے بادشاہ تیری تعظیم نہیں کی۔ وہ تیرے معبودوں کی عبادت نہیں کرتے اور اُس سونے کی مورت کو جسے تو نے نصب کیا ہے سجدہ نہیں کرتے۔ تب نبوکدنضر نے قہر و غضب سے حکم دیا کہ سدرک، میسک اور عبدنجو کو حاضر کریں اور انہوں نے اُن آدمیوں کو بادشاہ کے حضور میں حاضر کیا۔ نبوکدنضر نے اُن سے کہا اے سدرک اور میسک اور عبدنجو، کیا یہ سچ ہے کہ تم میرے معبودوں کی عبادت نہیں کرتے ہو اور اُس سونے کی مورت کو جسے میں نے نصب کیا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سجدہ نہیں کرتے؟ اب اگر تم مستعد رہو اور رباب اور بربط اور چغانہ اور ہر طرح کے ساز کی آواز سنو تو اُس مورت کے سامنے جو مَیں نے بنوائی ہے گر کر سجدہ کرو تو بہتر، پر اگر سجدہ نہ کرو گے تو اُسی وقت آگ کی جلتی بھٹی میں ڈالے جاؤ گے اور کونسا معبود تم کو میرے ہاتھ سے چھڑائیگا۔ سدرک اور میسک اور عبدنجو نے بادشاہ سے عرض کی کہ اے نبوکدنضر اس امر میں ہم تجھے کوئی جواب دینا ضروری نہیں سمجھتے۔ دیکھ ہمارا خدا جس کی ہم عبادت کرتے ہیں ہم کو آگ کی جلتی بھٹی سے چھڑانے کی قدرت رکھتا ہے، اور اَے بادشاہ وہی ہم کو تیرے ہاتھ سے چھڑائے گا۔ اور نہیں تو اے بادشاہ تجھے معلوم ہے کہ ہم تیرے معبودوں کی عبادت نہیں کریں گے اور اُس سونے کی مورت کو جو تو نے نصب کی ہے سجدہ نہیں کریں گے۔ تب نبوکدنضر قہر سے بھر گیا اور اس کے چہرے کا رنگ سدرک اور میسک اور عبدنجو پر متبدل ہُوا اور اس نے حکم دیا کہ بھٹی کی آگ معمول سے سات گنا زیادہ کریں اور اس نے اپنے لشکر کے چند زور آور پہلوانوں کو حکم کیا کہ سدرک اور میسک اور عبدِنجو کو باندھ کر آگ کی جلتی بھٹی میں ڈال دیں۔ تب یہ مرد اپنے زیر جاموں، قمیصوں اور عماموں سمیت باندھے گئے اور آگ کی جلتی بھٹی میں پھینک دیئے گئے۔"

(دانی ایل، باب ۳۔ آیات ۱-۲۲)

ان دونوں بچوں نے ہیڈ ماسٹر کو اس امر کا یقین دلایا کہ انہوں نے یہ طرزِ عمل کسی شوخی، یا گستاخی کے شوق یا جذبہ بغاوت کی وجہ سے نہیں کیا بلکہ وہ جھنڈے کی سلامی کو اپنے عقائد کے اعتبار سے بہت بڑی گمراہی خیال کرتے ہیں۔ جھنڈا جو ان کی مملکت کا نشان ہے انہیں اس کا پورا پورا پاس ہے مگر وہ اسے بُت بنا کر کسی صورت بھی اس کی پرستش پر تیار نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے اپنے ہیڈ ماسٹر کی توجہ کتاب خروج باب ۲۰ کی مندرجہ ذیل آیات کی طرف بھی مبذول کرائی:

"میرے حضور تو غیر معبودوں کو نہ ماننا۔

تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان یا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔ تو ان کے آگے سجدہ نہ کرنا اور نہ اُن کی عبادت کرنا۔
کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں۔"

سکول کے ہیڈ ماسٹر نے ایک نہ سنی اور نہ صرف انہیں سکول سے خارج کیا بلکہ انہیں جھنڈے کی توہین کے الزام میں پولیس کے حوالے کر دیا اور یہ بچے قید کر دیئے گئے۔ ان کے والدین نے رہائی کے لیے تگ و دو شروع کی اور معاملہ عدالتِ عالیہ میں پیش ہوا۔ وکلائے عدالت پر یہ حقیقت واضح کرنے کے لیے اپنا سارا زورِ استدلال صرف کیا کہ ان بچوں کے اس فعل کا محرک قومی نشان کی توہین نہ تھا۔ یہ مذہبی عقائد کا معاملہ ہے اور عوام کو اس بارے میں گھانا کے دستور نے آزادی دے رکھی ہے۔ حکومت کو مذہبی معاملات میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر اس مقدمے کے سب سے بڑے گواہ تھے۔ انہیں عدالت میں طلب کیا گیا اور اُن سے مختلف سوالات پوچھے گئے۔ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے اس امر کا اعتراف کیا کہ وہ اگرچہ دینِ مسیحی کے سچے پیرو ہیں اور اس کے احکام کو مانتے ہیں۔ لیکن وہ پارلیمنٹ کے قوانین کو مذہبی احکام پر ترجیح دیں گے۔ انہوں نے اس حقیقت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا:

"میں بلاشبہ مسیحی ہوں اور کئی اعتبارات سے ایک اچھا مسیحی ہوں۔ میں دس احکام کو بھی دل و جان سے مانتا ہوں اور اُن پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن اگر گھانا کی پارلیمنٹ مجھے یہ حکم دے کہ جو لڑکا تمہارے پاؤں پر قدم رکھے اُسے ہلاک کر دو تو میں دس احکام کو پوری طرح پیشِ نظر رکھنے اور اُن کی اہمیت محسوس کرنے کے باوجود اُسے بلا تامل قتل کر دوں گا۔"

عدالت نے بھی ہیڈ ماسٹر صاحب کے موقف کی تائید کی اور بچوں کی سزاؤں کی توثیق کرتے ہوئے یہ فیصلہ صادر کیا:

"مجرم بلاشبہ کم عمر اور مڈل سکول کے طلبہ ہیں۔ اس نوعمری میں انہیں اس بات کی اجازت نہ دینی چاہیے کہ وہ مذہبی احساسات اور اصولوں سے مغلوب ہو کر گھانا کے قوانین کو توڑنے کی جسارت کریں۔"

اس سزا کے بعد بچوں کو بورسٹل جیل بھیج دیا گیا اور وہاں ماہرینِ نفسیات کو اس بات پر مامور کیا گیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ وہ ان کا جائزہ لے کر بتائیں کہ آخر ان کے دماغ میں کیا خرابی ہوئی ہے کہ ان بچوں نے ملکی قانون توڑنے کی جسارت کی۔ لیکن معلوم ہوا کہ یہ بچے کسی ذہنی عارضے میں مبتلا نہیں۔ ان کی دماغی کیفیت بالکل ٹھیک اور درست ہے اور انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ کسی جذباتی پن کی وجہ سے نہیں بالکل سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ ان بچوں کا جیل میں طرزِ عمل بڑا اچھا اور قابلِ ستائش تھا اور انہوں نے جلد ہی وہاں اپنے لیے عزت و احترام کا اونچا مقام پیدا کر لیا۔ کچھ مدت کے بعد انہوں نے انصاف کے لیے عدالتِ عظمیٰ کی طرف رجوع کیا اور وہاں سے یہ دونوں بچے اس بنا پر رہا کر دیئے گئے کہ حکومت کو مذہبی معاملات میں دخل اندازی کا کوئی حق حاصل نہیں۔

عدالتِ عظمیٰ نے اگرچہ معاملے کو سادہ صورت دے کر بچوں کی رہائی کے احکام صادر کر دیئے مگر یہ معاملہ فی الحقیقت اتنا سادہ نہیں جتنا کہ جج صاحبان نے فیصلہ دیتے وقت اسے سمجھ لیا تھا۔ یہ تاریخ، تمدن، معاشرت بلکہ انسانیت کا ایک بنیادی اور اساسی معاملہ ہے کہ کیا خدا کے علاوہ کسی دوسری ہستی کو، خواہ وہ حکومت و مملکت ہو یا مطلق العنان بادشاہت یا مذہبی اجارہ داریاں، یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ قوانینِ الٰہی کے مقابلے میں اپنے بنائے ہوئے قوانین اور ضابطوں کی بالادستی قائم کریں۔ جس فعل کو ہم پرستش اور عبادت کہتے ہیں وہ محض چند الفاظ کی زبان سے ادائیگی یا چند حرکات کا نام نہیں بلکہ یہ خدائے واحد کے سامنے اس واضح حقیقت کا اظہار ہے کہ ہم اس کے مقابلے میں کسی دوسرے فرد یا ادارے کو خواہ وہ کتنا ہی باجبروت اور مقدس ہو، واجب الاطاعت نہیں سمجھتے اور اس کے احکام کے سامنے کسی دوسرے کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

قوانینِ ربانی اور چالاک اور عیار لوگوں نے اپنی خدائی قائم کرنے کے لیے جو قوانین وضع کر رکھے ہیں ان کے درمیان تصادم بالکل فطری ہے۔ اسلام میں تو شریعت اور قوانین کے درمیان قدم قدم پر تصادم ہوتا ہے، کیونکہ اسلام دین کا ایک جامع تصور پیش کرتا ہے جس کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی گوشہ بلکہ قلب و دماغ کا کوئی ریشہ بھی اس کے قوانین کے تسلط سے آزاد نہیں رہ سکتا۔ لیکن وہ

© rasailojaraid.com